بشیر احمد ڈار

گوتم بُدھ کا فلسفۂ اخلاق

عام طور پر مشہور ہے کہ گوتم کی زندگی، اس کا فلسفۂ حیات اور نظامِ اخلاق ہندو مت کے خلاف ایک احتجاجی تحریک اور ردِّ عمل تھا۔ لیکن اگر اس تحریک جدید کا غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ گوتم بُدھ کے فلسفہ حیات میں وہی بنیادی تصوّرات کارفرما ہیں جو اس سے پہلے یا اس کے عہد میں اُپ نشد کے مفکرین و صوفیاء نے بڑے شد و مد سے پیش کئے۔ اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ گوتم کی عظیم الشّان شخصیّت نے اس قدیم علمی و ثقافتی سرمایہ میں سے کچھ چیزیں لیا جو اُسے اپنے معاصری تقاضوں کے مناسب نظر نہ آئیں حذف کر دیں یا انہیں قابلِ اعتنا نہ سمجھا یا اُن پر اُس طرح زور نہ دیا جس طرح اُپ نشدوں میں ان کا ذکر ہے، لیکن یہ حقیقت تو بہر حال قابلِ تسلیم ہے کہ اس کے تمام نظامِ فکر کی بنیاد انہی چند اصولوں پر ہے جو اس سے ماقبل آریہ قوم کے بلند ترین مفکّرین نے پیش کئے تھے۔

اُپ نشد سنسکرت کے دو لفظوں سے مرکّب ہے۔ اُپ بمعنی نزدیک اور شد بمعنی بیٹھنا، یعنی اُپ نشد ان تمام تعلیمات کا نچوڑ ہیں جو ایک صوفی منش اور حکیم اُستاد اپنے شاگرد یا شاگردوں کو حیاتِ انسانی کے اہم مسائل کی وضاحت کے سلسلے میں سمجھاتا تھا۔ ان کی کل تعداد ایک سو اسّی ہے لیکن وہ کس زمانے میں مدوّن ہوئے اس کے متعلق کوئی آخری اور قطعی فیصلہ مشکل ہے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ وہ ۸۰۰ اور ۵۰۰ قبل مسیح کے درمیانی زمانے میں وجود میں آئے۔ ان کے بعض مصنّفین کے متعلق سوائے نام یا چند غیر واضح تفصیلات کے کچھ زیادہ معلوم نہیں۔ ان میں ایک یجنا ولکیا بہت مشہور ہے۔ اس کی مختصر سی زندگی کے حالات کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ گوتم بُدھ نے جو دولت، شہرت اور سلطنت کو خیر باد کہہ کر ایک بھکاری اور بھکشو کی زندگی اختیار کی تو وہ کوئی ایک انوکھا قدم نہ تھا۔ ایسا اقدام اس سے پہلے آریہ مفکّرین کا ایک مسلّمہ طریقہ تھا۔ چنانچہ یجنا ولکیا نے ایک دن اپنی خانگی زندگی ترک کر دینے کا فیصلہ کر لیا اور اس مقصد کے لئے اس نے اپنی کل جائداد اپنی دونوں بیویوں میں تقسیم کر دینی چاہی تاکہ ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ اس کی ایک بیوی نے کہا: اگر مجھے دنیا کی دولت حاصل ہو جائے تو کیا میں امر ہو سکتی ہوں؟ اس پر اس صوفی درویش نے جواب دیا: دولت تو انسان کو ابدی زندگی نہیں دے سکتی۔ یہ جواب سُن کر اس کی بیوی نے اس کے ساتھ جانے پر اصرار کیا تاکہ وہ بھی اس روحانی دولت سے اپنا دامن بھر سکے۔ ایسے انسانوں کی کمی نہ تھی جو دنیا کی دولت و آسائش، مادی وسائل کی فراوانی اور جسمانی لذّتوں سے محض اس لئے کنارہ کش ہو جانے پر ہر لمحہ تیار رہتے تھے تاکہ انہیں حیاتِ انسانی کے چند ان اہم سوالوں کا جواب میسر

آسکے جن کی پیہم خلش انہیں ہر وقت بے چین کئے دیتی تھی۔
اُپ نشدوں میں یہ سوالات اور اُن کے جوابات سبھی درج ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ زندگی کے انہیں لاینحل مسئلوں کی طرف اشارہ موجود ہے: "ہم کہاں سے آئے ہیں؟ ہم کہاں رہ رہے ہیں اور آخر ہم نے کہاں جانا ہے؟ اگر تم برہما سے واقف ہو تو ہمیں بتاؤ کہ آخر کس کے حکم سے ہم اس دُنیا میں کبھی خوشی اور کبھی رنج والم کی زندگی بسر کرتے ہیں؟ حقیقی مُؤثر یا تعلیلی قوت کا اصلی و آخری مظہر کون ہے ___ زمانہ یا فطرت؟ کیا یہ کائنات بالکل ایک اندھی اور بہری مشیئت ہے یا کسی بنیادی مقصد کے زیر اثر کام کر رہی ہے؟ کیا اس کا حقیقی مُؤثر وہی وجود ہے جسے پُرش کہتے ہیں جو روح اعلیٰ ہے؟"
ایک دوسری جگہ (میتری اُپنشد) میں ایک بادشاہ کا ذکر ہے جس نے ایسے ہی مسائل کے ہاتھوں اپنی سلطنت کو چھوڑ کر جنگلوں کی راہ لی اور ریاضت شروع کی۔ کئی سالوں کی تپسیا کے بعد ایک دن اسے ایک راہب ملا جو کائنات کے پوشیدہ رازوں سے باخبر تھا۔ بادشاہ نے اس سے التجا کی تو اس نے گول مول جواب دے کر ٹالنے کی کوشش کی، لیکن جب اس نے سائل کا انتہائی ذوق وشوق دیکھا تو انسانی روح کے متعلق یوں گویا ہُوا:
"یہ انسانی جسم ہڈیوں، گوشت، پوست، خون وغیرہ کے مجموعہ کا نام ہے اور اس کی زندگی چند لمحوں سے زیادہ نہیں۔ ایسی حالت میں خواہشات کی غلامی کیسی حقیر چیز ہے؟
یہ انسان جو ہر لمحہ اپنے حیوانی مطالبات کی تسکین میں لگا رہتا ہے، جو غصہ، لالچ، ڈر، نا اُمیدی، جدائی، بھوک، پیاس، بڑھاپا، موت، بیماری اور غم و رنج کا شکار ہے ___ خواہشات کی غلامی میں کیوں مبتلا ہے؟
اس کائنات کی طرف دیکھو جو ان چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑوں کی طرح پیدا ہوتی ہے اور مر جاتی ہے...
یہ سمندر جو اپنی وسعت اور گہرائی کے لحاظ سے ہمیشہ قائم رہنے والے معلوم ہوتے ہیں ایک دن خشک ہو جانے والے ہیں، پہاڑوں کی یہ بلند و بالا چوٹیاں، ستاروں کی یہ پیہم گردش، ہواؤں کا چلنا، چاند اور سورج یہ سبھی چیزیں چند لمحوں کے مہمان ہیں! زندگی کے اس مسلسل اور بے فائدہ چکر میں آخر انسان خواہشات کی غلامی میں کیوں مبتلا ہے جبکہ اسے علم ہے کہ ایسی حیوانی زندگی اختیار کرنے سے وہ آواگون کے چکر سے نجات حاصل نہیں کر سکتا؟"
اس کا راز کیا ہے؟ اور اس کا ذریعہ کون سا ہے؟ رگ وید میں عام طور پر آفاق پر زور دیا جاتا رہا۔ اگر تم اس راز سے واقف ہونا چاہتے ہو تو اپنے اردگرد اس کائنات کا مطالعہ کرو جو دن رات کے چوبیس گھنٹے تمہارے سامنے اپنے راز سربستہ کھولنے پر آمادہ ہے۔ لیکن اُپنشدوں نے آفاق کی بجائے انفس کو بہتر اور زیادہ صحیح راستہ سمجھا۔ ان کے نزدیک یہ کائنات خاموش ہے، بے مقصد ہے، ظالم ہے۔ جب تک اس کی طرف سے آنکھیں اور دیگر حواس کو بند نہ کیا جائے راز سربستہ کا انکشاف ممکن نہیں ع

"لب بہ بند و چشم بند و گوش بند"

ہی ایک صحیح راستہ ہے۔ حقیقت کا جلوہ اس آسمان و زمین میں نہیں بلکہ قلب کی گہرائیوں میں مضمر ہے، انسان کا قلب وہ سوراخ ہے جس میں سے کائنات اور حقیقت ازلی کا نظارہ کیا جا سکتا ہے، یہ بیرونی اور خارجی نہیں بلکہ اندرونی اور قلبی آکاش ہے جو ہمارے سوالات کا جواب دے سکتا ہے۔ جب وہ اس منزل کی طرف رواں دواں چلتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ انسانی روح اور روح ازلی ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ ایک گورو نے اپنے مرید سے کہا:

"انجیر کا ایک دانہ لاؤ"

"یہ لیجئے"

"اسے کاٹو"

"لیجئے، میں نے کاٹ ڈالا ہے"

"اس میں تم کیا دیکھتے ہو؟"

"صرف چند چھوٹے چھوٹے بیج ہیں"

"ایک بیج کو لے کر اسے کاٹو"

"لیجئے میں نے کاٹ ڈالا ہے"

"اب تم کیا دیکھتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں!"

"سنو، پیارے بیٹے، یہی نظر نہ آنے والی چیز، یہی بسیط شے جس کے متعلق تم نے کہہ دیا کہ کچھ بھی نہیں، اسی بسیط اور غیر مرئی چیز سے یہ بڑا درخت پیدا ہوا، بڑھا اور پھل لایا۔ اے میرے پیارے بیٹے، یقین رکھو کہ ویسی ہی بسیط اور غیر مرئی "حقیقت" ہے جو اس تمام کائنات کی روح ہے۔ یہی رازِ حقیقت ہے۔ یہی آتما ہے۔ تت توام اسی — یہی تم ہو، اے میرے بیٹے!"

اسی راز کے جاننے پر نجات کا امکان ہے۔ جو شخص اس زندگی کے ظاہری اور مادی پہلوؤں کی خیرگی سے متاثر ہو کر حقیقت سے بے نیاز ہو گیا اس کے لئے سوائے آواگون کے چکر کے اور کوئی راستہ نہیں۔ وہ ایک نہیں، ہزاروں موتوں سے گزر کر بھی حیاتِ ابدی نہیں پا سکے گا اور اسی طرح سنسار میں مختلف شکلوں میں چکر لگاتا رہے گا۔ نجات کا راستہ صرف ایک ہے — زندگی اور اس کے مادی لوازمات سے گریز، تپسیا اور حقیقت مطلقہ اور صداقت کا علم۔ اس کے بعد وہ زندگی اور موت کے ظالمانہ پنجے سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے گا اور ایک امر زندگی کا حامل۔ لیکن کیا اس زندگی کو ہم زندگی کہہ سکتے ہیں؟ کیا یہ ابدی موت تو نہیں؟ اپنشدوں پر اگر اعتماد کیا جائے تو نجات یافتہ حالت زندگی کی بجائے ابدی موت کہلانے کی زیادہ مستحق ہے۔ جس طرح ایک بہتا ہوا دریا آخر کار سمندر کی وسعت اور گہرائی میں جا کر ختم ہو جاتا ہے، اپنے وجود اور

تشخص سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اسی طرح دانا اور حکیم اپنے اصلی مرکز میں جا کر مدغم ہو جاتا ہے، اس کا نام اور شکل و روپ، اس کی خودی اور انفرادیت، اس کی ہر چیز جس کی بنا پر وہ اپنے آپ کو "میں" سے پکار سکتا ہے، ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہے۔ یہی ابدی سکون ــــ جس میں نہ حرارت ہے نہ تگ و دو، نہ حرکت نہ تڑپ، جو ہر اُس چیز اور کیفیت سے خالی اور عاری ہے جس کو ہم "زندگی" کے نام سے پکارتے اور جانتے ہیں، جہاں مطلق خاموشی، بے حسی اور لاعلمی طاری ہے اور جہاں کسی چیز کے ہونے یا نہ ہونے کا احساس بھی موجود نہ ہو ــــ اس ابدی سکون یعنی ہمیشگی کی موت ہی انسان کی نجات ہے اور یہی ان کے خیال میں ہر دانا حکیم کا آخری مطمح نظر اور غایت منزل۔

لیکن جہاں ایسے بلند پایہ تصورات لوگوں کی زندگیوں پر اثر انداز تھے وہاں دوسری طرف مذہبی زندگی کی ظاہر پرستی اور مادی زندگی کی کشش و دلچسپیاں بھی ہر جگہ نمایاں تھیں۔ مندروں کے پجاریوں اور برہمنوں نے مذہب کو اپنی خواہشات کا غلام بنا رکھا تھا اور روحانیت کی بجائے لوگوں کی توجہ اس کے ظاہری رسوم اور قربانیوں پر مرکوز کر دی تھی۔ ایسے ہی ظاہر پرست علماء کے متعلق اپنشدوں نے بہت سخت الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ یہ علماء ان کتوں کی مانند ہیں جو ایک دوسرے کے پیچھے قطار در قطار شہروں اور دیہاتوں میں چکر لگا رہے ہوں اور ان کی زبان پر ہر وقت یہی کلمات ہوں: "اوم، آؤ کھائیں، اوم، آؤ پئیں!" مہاتما بدھ کی پیدائش سے قبل اور ان کی شروع زندگی میں بھی مختلف قسم کے ایسے رجحانات ظاہر ہو رہے تھے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عوام اور خواص میں ایک طرح کی روحانی بے چینی و کسک سی محسوس ہو رہی تھی، لوگ علماء کی ظاہر پرستی اور جمود سے تنگ آ کر خود مذہب سے برگشتہ ہو چکے تھے اور ویدوں اور اُپنشد، خدا، اور اخلاق سب سے بیزاری کا اعلان کر رہے تھے۔ اس ذہنی نزاع اور اخلاقی شکوک و شبہات کو سیاسی بے چینی اور فقدان امن نے اور ہوا دی۔ ہر طرف سے احتجاج کی آوازیں بلند تھیں۔ چنانچہ بدھوں کی ایک کتاب میں مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے: "ان امیروں کو دیکھو جنہوں نے بے وقوفی سے اتنی دولت جمع کر رکھی ہے اور جس میں سے وہ غریبوں اور ناداروں کو کچھ دینا پسند نہیں کرتے بلکہ اور زیادہ دولت اکٹھی کرنے اور چند روزہ زندگی کو عیش و عشرت سے بسر کرنے پر تُلے بیٹھے ہیں۔ ان بادشاہوں کو دیکھو جن کی سلطنت کافی وسیع ہے اور جس کا انتظام بھی انہیں تسلی بخش نہیں ہو سکتا لیکن اس کے باوجود ان کی حرص و آز کی انتہا یہ ہے کہ وہ سلطنت کی توسیع میں ہر جائز و ناجائز طریقہ سے گریز نہیں کرتے۔ لیکن ان کا انجام کیا ہے؟ محض موت جس کے بعد نہ ان کی دولت، نہ حشمت، نہ اولاد اور نہ احباب کسی کام آ سکتے ہیں۔"

جب گوتم جوان ہوا اس وقت تمام شمالی ہندوستان میں سوفسطائی گروہ پھیلا ہوا تھا۔ اس مذہب کے لوگ عام طور پر مادیت کے حامی ہوتے تھے اور ان کا کام بحث مباحثہ اور مناظرہ تھا۔ وہ شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ پھرتے اور تمام مخالفوں کو مناظرہ کی دعوت دیتے۔ ان میں سے بعض منطق کی تعلیم دیتے تھے اور ان کا دعوےٰ تھا کہ سیاہ کو سفید اور سفید

کو سیاہ ثابت کرنا ایک فن اور علم ہے کیونکہ درحقیقت نہ کوئی شے اصلاً سیاہ ہے اور نہ سفید، نہ خدا ہے اور نہ نیک و بد کی کوئی مطلق تمیز۔ ان مناظرہ بازوں کی گرم بازاری کا یہ حال تھا کہ ہر بڑے شہر میں ان کے لئے عالی شان مکان بنے ہوئے تھے جہاں ان کی بہت آؤ بھگت اور تواضع ہوتی تھی۔ ان سوفسطائی مناظرہ بازوں میں برہسپتی سب سے زیادہ مشہور تھا جس کے چند اقوال منقول ہیں جن میں اس نے خدا، جنت، ابدی زندگی، اخلاق، علمائے مذہب سب کا تمسخر اڑایا ہے۔ فلسفۂ مادیت کا سرگروہ چارواک اسی سوفسطائی گروہ کی تیار کردہ زمین کی پیداوار تھا۔ اس حکیم کے نزدیک یہ کائنات خود بخود پیدا ہوئی اور موت کے بعد کوئی اور زندگی کا امکان نہیں۔ یہ حواس ہمارے تمام علوم کا سرچشمہ ہیں ——— اور ان کے علاوہ اور کوئی ذریعہ علم ہمارے پاس نہیں۔ نفس انسانی خالص مادہ ہے اور روح کا کوئی وجود نہیں۔ مذہب اور دین صرف چند مسخرے اشخاص کا ڈھکوسلہ ہے۔ فطرت نیکی اور بدی میں کوئی امتیاز نہیں کرتی، سورج ہوا اور پانی سب انسانوں کے لئے عام ہیں۔ جذبات اور خواہشات پر قابو پانے کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ فائدہ۔ زندگی کا مقصد زندگی اور خوشی ہے۔

اس غیر مستقیم ماحول میں مہاویر اور گوتم پیدا ہوئے اور چارواک کے مادی فلسفہ کی اسے کامیابی سمجھئے کہ ان دونوں مذاہب نے "خدا" اور "روح" کے تصورات کو اپنے نظام میں گھسنے نہ دیا۔ یہ مذہب ہوتے ہوئے بھی لاادریت کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ دونوں میں ایک اور اہم بات بھی مشترک ہے۔ گوتم اور مہاویر دونوں برہمن نہ تھے۔ بلکہ کشتری تھے۔ جس واقعہ سے بعض مغربی مؤرخین اور نقاد یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ دونوں تحریکیں گویا برہمنوں کے خصوصی اختیارات کے خلاف ایک طرح کی بغاوت تھیں۔ اس کے علاوہ ایک اور چیز قابلِ غور ہے۔ ان دونوں کے اولیں پیرو برہمن اور امیر طبقہ سے آئے۔ یہ واقعہ خود تعجب انگیز ہے کیونکہ جہاں تک دینی تاریخ کے صفحات سے معلوم ہوتا ہے پیغمبروں کے اولیں پیرو عموماً نچلے درجے کے لوگ ہوتے تھے۔ ایک اصلاحی تحریک کی ضرورت قوم کو ہوتی ہی اس وقت ہے جب اس کے علماء جامد اور جاہ پسند ہو جائیں اور اس کے امراء عیاشی اور زرکشی میں مبتلا ہوں اور اس طرح دونوں گروہ دین اور دنیا کے نام پر عوام کا خون چوس رہے ہوں۔ چنانچہ قرآن نے بار بار ان چیزوں کو دُہرایا کہ قوموں کی تباہی کا عمومی باعث ان کے امیروں کی عیاشیاں اور حق فراموشی ہوتا ہے:

واذا اردنا ان نهلک قریة امرنا مترفیها ففسقوا فیها فحق علیها القول فدمرناها تدمیرا۔	جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو ہم اس کے عیش پرست اور خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں پس وہ جی بھر کر فسق و فجور کرتے ہیں، پھر ان پر ہمارا قول پورا ہو جاتا ہے پس ہم ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے ہیں۔

اس طرح حضرت نوح کے ذکر میں اس چیز کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ آپ کے پیرو عوام میں سے تھے جن کو امراذیل

سمجھتے تھے اور اسی لئے حضرت نوح کی پیروی سے گریز کرتے تھے :

فقال الملاء الذین کفروا من قومہ ما نراك الا بشراً مثلنا وما نراك اتبعك الا الذین ھم اراذلنا بادی الرای۔

نوح کی قوم کے سرداروں نے جو کافر تھے یہ دلیل پیش کی کہ ہم تجھے اپنے ہی جیسا ایک انسان پاتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ تیرے ماننے والے وہی لوگ ہیں جو ہم میں سے سب سے زیادہ ذلیل و خوار اور پست ہیں۔

حضرت عیسیٰ کے اوّلین ماننے والے حواری سب معمولی طبقے کے ماہی گیر اور مزدور پیشہ لوگ تھے۔ اسی طرح قیصر روم نے جب آں حضرت کے متعلق ابو سفیان سے مختلف سوالات کئے تو ان میں سے ایک سوال یہی تھا کہ اس کے پیروؤں کی کثیر تعداد کس طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ جب ابو سفیان نے اپنی طرف سے بڑی حقارت سے یہ جواب دیا کہ نچلے طبقے کے آدمی زیادہ ہیں تو ہرقل نے کہا کہ ایک صحیح پیغمبر کے پیرو ایسے ہی ہو سکتے ہیں۔ ان تمام تاریخی واقعات کی روشنی میں دیکھا جائے تو گوتم بدھ اور مہاویرا کے ابتدائی مریدین کی کثرت کا علماء اور امراء سے ہونا تعجب انگیز ضرور ہے۔

گوتم بدھ جس کا اصلی نام سدھارتھ تھا تقریباً ۵۶۷ قبل مسیح میں کپل وستو میں پیدا ہوا جو بنارس سے تقریباً ۱۳۰ میل شمال کی طرف واقع تھا۔ اس کی زندگی کے حالات مشہور ہیں۔ جب وہ ۲۹ برس کا ہوا تو اس نے تاج و تخت کو ترک کرنے کا فیصلہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دیوتا اس کے سامنے مختلف شکلوں میں نمودار ہوا۔ ایک بوڑھا شخص جو عمر کے بوجھ سے خمیدہ کمر ہو چکا تھا، ایک بیمار، ایک سڑی ہوئی لاش۔ بعض روایات میں مذکور ہے کہ یہ خارجی دنیا کے تجربات نہ تھے بلکہ محض ذہنی تصورات تھے۔ غرض حقیقت کچھ بھی ہو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر قسم کی فراوانی اور عیش و آرام کے باوجود گوتم کا ذہن ان سے سکون حاصل نہ کر سکا۔ دل کا اطمینان مال و دولت کی کثرت یا قلت پر منحصر نہیں بلکہ زندگی کے روزمرّہ اور بنیادی سوالات کے تشفی بخش جوابات سے حاصل ہوتا ہے ـــــ بعض دفعہ ایک حساس دل اور سیلانی مغز انسان کے لئے زندگی کے معمولی واقعات بھی بے اطمینانی کا موجب ہو جاتے ہیں۔ کلدان کا ہر شخص ہر روز ستاروں، چاند اور سورج کے اتار چڑھاؤ کا مطالعہ کرتا تھا لیکن کسی کے دل میں وہ سوالات اور وہ ذہنی بے چینی پیدا نہ ہو سکی جس نے حضرت ابراہیم کو کئی دنوں تک بے چین رکھا۔ زندگی کی گہما گہمی باوجود اور ظاہری شان و دولت کے ہوتے ہوئے بھی انسان مصیبت میں کیوں مبتلا ہیں؟ کیا کوئی ذریعۂ نجات ہے؟ حضرت ابراہیم اپنے ذہنی غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ آفلین کی محبت دراصل تمام بیماریوں کی جڑ ہے اور اس سے نجات ایک حی و قائم خدا سے لو لگانے میں ہے۔ ہر چیز جو غروب ہو جاتی ہے، جس کی زندگی اور حیات کا دارومدار چند لمحوں سے زیادہ نہیں، ہر وہ شے جو پائیداری اور استحکام سے محروم ہو انسان کی محبوب نہیں ہونی چاہئے اور وہ کونسی چیز ہے جو اس دائرہ سے خارج ہے؟ مال، دولت، بیوی، بچے، عزت، شہرت، تندرستی، غرض ہر چیز آفلین میں آجاتی ہے اور اس لئے آپ نے

کو غلامی کرانا ہی حقیقی نجات کا راستہ ہے۔ لا احب الآفلین۔ اسی طرح گوتم بدھ نے ان تمام بتکدہ ہائے تصورات سے نجات حاصل کرنی چاہی۔ موت، بیماری، بڑھاپا یہ کن چیزوں کی طرف اشارے ہیں؟ اس طرف کا انسانی زندگی جس سے ہر انسان بلا وجہ چمٹا ہوا ہے ایک ناپائدار حقیقت ہے، آنی و فانی ہے۔ اس لئے اس کو مقصود حیات بنانا ہی بنیادی بیماری ہے اور نجات کا راستہ صرف اس راز سے واقف ہونے میں مضمر ہے کہ آفلین کی محبت کو دل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکال دیا جائے۔

ہر کہ در اقلیم لا آباد شد　　فارغ از بند زن و اولاد شد

لیکن اس سلبی نتیجہ پر پہنچنے تک تو گوتم بدھ اور حضرت خلیل کا طریقۂ کار مشترک تھا مگر جب اس نفی کے بعد مثبت قدم اٹھانے کا مسئلہ پیش آیا تو ان کے نظریات میں بُعد المشرقین پیدا ہو جاتا ہے اور یہیں سے ان کے راستے دو مختلف سمتوں میں بٹ جاتے ہیں۔ "لا" کہنا زندگی کی حرکت کے لئے ضروری ہے لیکن یہ صرف پہلا اہم قدم ہے، ہنگامہ کے بغیر انسان کوئی تخلیقی کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتا۔

درجہاں آغاز کار از حرف لاست　　آں نخستیں منزل مرد خداست

لیکن بدھ کا فلسفۂ حیات لا کے بعد الا، نفی کے بعد اثبات سے عاری ہے۔ اگر آپ بصد کاوش الا کی تلاش میں کامیاب ہو بھی جائیں تو یہ الا محض بے رنگ جیسے صفات، بے حقیقت نظر آئے گا جو الا ہوتے ہوئے بھی لا کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔

او بہ لا در ماند و تا الا نرفت　　از مقام عبدہٗ بیگانہ رفت

جب گوتم دولت، سلطنت، زن و اولاد کے بندھن توڑ کر اقلیم لا میں آباد ہوا تو اسے لامحالہ الا کی تلاش درپیش ہوئی اور اس مقصد کے لئے اس نے سب سے پہلے ایک برہمن سادھو کی شاگردی اختیار کی جو بندھیاچل کے پہاڑوں میں مختلف شاگردوں کے ساتھ حقیقت کی تلاش میں مشغول تھا۔ اس کی زیر ہدایت گوتم نے تمام مقدس کتابوں کا مطالعہ شروع کیا اور ہر قسم کی ریاضت کی۔ لیکن چند سالوں کی رفاقت، مطالعہ اور محنت کے بعد گوتم کو اپنی ناکامی کا احساس ہوا۔ اگرچہ اس پُر فضا ماحول میں رہتے ہوئے جزوی اطمینان اسے ضرور نصیب ہوا لیکن بنیادی سوالات کا جواب اور دل کی کسک جوں کے توں رہے۔ مجاہدات سے اسے اعلیٰ مقامات طے کرنے میں کامیابی تو ضرور ہوئی اور زخموں کی شدت مندمل بھی ہوتی معلوم ہوئی لیکن بہت جلد اسے احساس ہوا کہ اسے اندمال کی ضرورت نہیں بلکہ زخموں کی اصل بیماری کو جڑ سے اکھیڑنا ہے اور یہی وہ چیز تھی جو وہ حاصل نہ کر سکا۔ وہ اوپرا اور سطحی علاج نہ چاہتا تھا۔ اسے تو بیماری کے اصلی وجوہ کی تلاش تھی تاکہ ان کو ہمیشہ کے لئے ختم کیا جا سکے۔ اس کے بعد وہ ایک دوسرے استاد کے پاس پہنچا، لیکن وہاں بھی کچھ مدت کے بعد اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ یہ دونوں برہمن قدیم ہندو دینی اور فلسفیانہ تصورات کے مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے تھے۔ جو مختلف چھ مدارس فکر آج ہندؤں

میں مروج ہیں وہ تو بہت بعد کی پیداوار ہیں، گوتم کے زمانے میں صرف ان کی ابتدا ہوئی تھی اور مختلف لوگ اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے زندگی کے مسائل پر رائے زنی کیا کرتے تھے۔ اس طرح گویا گوتم نے ان دو استادوں سے ان تمام مختلف نظریاتِ فکر کا مطالعہ کر لیا جو اس کے زمانے میں مروج تھے اور جو بعد میں ہندو مت کا جزو قرار پائے۔ گوتم کی ناکامی کا مطلب گویا یہ تھا کہ ویدوں اور اپنشدوں کی مروجہ تشریح اس کے نزدیک قابلِ قبول نہیں تھی۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ان علمی جواہر ریزوں کو اس نے بالکل درخورِ اعتنا نہیں سمجھا بالکل غلط ہے کیونکہ جو نظامِ اخلاق گوتم بدھ کے نام سے مشہور ہے اور جس فلسفۂ حیات کی طرح اس نے ڈالی، وہ تمام انہی کتبِ مقدسہ پر مبنی ہے اور اسی سرچشمہ سے سیراب ہے۔ اگرچہ یہ چیز بھی اپنی جگہ ناقابلِ تردید ہے کہ اس کی عظیم الشان شخصیت اس محدود دائرہ میں محصور نہ رہ سکی اور اس نے ہندوستان کے مختلف نظام ہائے فکر میں اپنے لئے ایک علیحدہ اور مستقل جگہ پیدا کر لی۔

کیا ریاضت اور تپسیا سے روشنی میسر آسکے گی؟ کیا یہ انسانی جسم اس روحانی نور کے راستے میں تو رکاوٹ نہیں؟ گوتم کے دل میں اس خیال کا آنا تھا کہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اب کسی استاد اور گورو کے پاس جانے کی بجائے اس نظریہ کو آزمائے گا۔ اگر خالص علمی مشاغل اور فلسفیانہ تفکرِ حیات کی پیچیدہ گتھیوں کو نہیں سلجھا سکتے تو شاید عملی ریاضت اور مجاہدات آنکھوں سے پردہ اٹھائیں۔ اگر قیل و قال، عقل و تدبر سے گوہرِ مقصود ہاتھ نہیں آیا تو ممکن ہے کہ اس راستے سے ہی آبِ حیات تک پہنچنے کا امکان پیدا ہو جائے۔ اس فیصلہ کے بعد گوتم چپ چاپ روانہ ہوا اور جہاں آج کل بدھ گیا کا مندر ہے وہاں اُرویلا کے جنگلوں میں نیا تجربہ شروع کیا۔ اس زمانے میں یہ عقیدہ تھا کہ ریاضت سے انسان میں مافوق الفطرت طاقتیں اور گہری نظر پیدا ہو جاتی ہے۔ گوتم نے کھانا پینا اتنا کم کر دیا کہ اس کا جسم محض ہڈیوں کا ڈھانچا رہ گیا اور اس حالت میں ہلنا جُلنا اُٹھنا بیٹھنا ممکن نہ رہا۔ پانچ سادھو اس کی ریاضت کو دیکھ کر اس کے گرد جمع ہو گئے تھے اور انہیں بجا اُمید تھی کہ گوتم چند ہی دنوں میں مہاتما کے درجہ تک پہنچ جائے گا لیکن بدقسمتی سے گوتم کو یہ ریاضت بالکل راس نہ آئی۔ وہ خدائی فرمانروائی اور فوق الانسانی طاقتوں کا خواہشمند نہ تھا جو اس طریقہ پر قناعت کر لیتا۔ اسے تو انسانی زندگی کے روزمرہ کے مسائل سے دلچسپی تھی۔ وہ قوت اور معجزے نہ چاہتا تھا وہ حیات کی جو اس کے نزدیک ہمہ تن سوال تھی پیچیدہ گتھی حل کرنا چاہتا تھا اور یہی وہ مقصد تھا جو اس طرزِ زندگی سے حاصل نہ ہو سکا۔ ایک دن اسی ذہنی کشمکش میں مبتلا وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور گر پڑا۔ اس کے ساتھیوں نے سمجھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا لیکن انسانوں کی خوش قسمتی تھی کہ گوتم اس مرحلے سے جانبر ہُوا۔ اس کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ دوبارہ کھانا کھائے گا اور معمول کی زندگی بسر کرے گا۔ اس وقت ایک عورت دودھ اور چاول لے کر آئی اور گوتم نے کھا لئے۔ جب ان پانچوں شخصوں نے گوتم کو کھانا کھاتے دیکھا تو وہ اس کی تپسیا کے مفید نتائج سے نااُمید ہو کر لوٹ گئے۔ لیکن گوتم کے لئے حقیقت ابھی تک اتنی ہی دور تھی جتنا پہلے اور زندگی اسی طرح ہمہ تن سوال۔ چھ سال کی جسمانی ریاضت کے بعد وہ اس صداقت کو پا چکا تھا کہ

اس کے مقصد کے لئے یہ طریقۂ کار بالکل لایعنی ہے۔ دولت و ثروت، علمی مباحث اور فلسفیانہ افکار، صوفیانہ مجاہدات سبھی کو آزمایا گیا اور سب بے کار ثابت ہوئے۔ اس کے بعد اس نے ایک درخت کے نیچے ڈیرا جمایا اور مراقبہ اور عبادت شروع کی۔ اس دفعہ اس نے تہیّہ کر لیا کہ جب تک وہ اپنا مقصد حاصل نہیں کرے گا یہاں سے نہیں اُٹھے گا۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ سات ہفتے کے بعد اسے روشنی نظر آئی جس کے بعد اس کی ذہنی کش مکش ختم ہو گئی، اس کے سب سوالوں کا جواب مل گیا، انسانی زندگی کی تمام لاینحل گتھیاں سلجھ گئیں اور گوتم صحیح معنوں میں "بدھ" یعنی نور سے منور ہو گیا۔ کئی سالوں کی انتہائی محنت کے بعد گوتم اپنے مقصد میں کامیاب ہُوا۔

لیکن یہ روشنی جس کا گوتم نے دعوے کیا آخر کیا چیز تھی؟ جب ہم پڑھتے ہیں کہ اس نے آریاؤں کے تمام فکری اور حکیمانہ ورثے کو حاصل کر لیا اور وہ بھی اپنے زمانے کے بہترین استادوں سے اور اس کے باوجود اس کے قلب کو اطمینان نصیب نہ ہُوا، اس کا ذہنی انتشار رفع نہ ہو سکا، اس کے سوالات کا تشفی بخش جواب نہ مل سکا، تو آخر اس "روشنی" میں وہ کون سی خصوصیّت تھی جس نے تمام مسائل کی گرہیں ایک ایک کر کے کھول دیں اور وہ رازِ حیات سے باخبر ہو گیا، اس واقعہ سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک دن اس کے قلب میں روشنی پیدا ہو گئی جس سے اسے وہ اطمینانِ قلب حاصل ہو گیا جس کی اسے مدتوں سے خواہش تھی۔ یہ کیفیت کوئی گوتم سے مخصوص نہیں۔ تمام قوموں کا صوفیانہ لٹریچر اس طرح کے تجربات سے بھرا ہُوا ہے۔ اگر اس سلسلے میں گوتم اور غزالی کا مقابلہ کیا جائے تو کئی حیثیتوں میں ان کی زندگی اور تجربات میں مماثلت نظر آئے گی۔ دونوں اپنی علمی روایات سے پورے طور پر بہرہ ور تھے اور ان کا یہ اکتساب کوئی معمولی درجے کا نہ تھا بلکہ خالص علمی اور ناقدانہ۔ دونوں کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خود اور ان کی قوم ایک عمیق اخلاقی گراوٹ میں مبتلا ہیں جس سے نکلنے کے لئے خالصۃً ایک اخلاقی طریقہ کار اختیار کیا جانا ضروری ہے۔ دونوں کافی عرصہ تک اس ذہنی کش مکش میں مبتلا رہے اور صحیح راستے کی تلاش میں اپنے حکیمانہ اور فلسفیانہ لٹریچر کا مطالعہ بھی کیا لیکن اس میں انہیں سوائے مایوسی اور ناکامی کے اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اس کے بعد وہی مراقبات اور مجاہدات جس کے نتیجہ میں دونوں کے دل میں روشنی دکھائی دی اور اس کے ساتھ ہی تمام لاینحل مسائل حل ہو گئے۔ منقذ میں اسی ذہنی اور قلبی بیماری کا ذکر کرنے کے بعد غزالی کہتے ہیں کہ اس بیماری سے نجات اس نور سے ہوئی جو حضرت حق سبحانہٗ نے میرے دل میں ڈالا تھا اور یہی نور اکثر عرفانی امور کی تالی اور کنجی ہے۔ پس جس شخص نے یہ گمان کیا کہ کشفِ حقائق صرف دلائل (علمی) پر موقوف و منحصر ہے اس نے اللہ کی رحمت وسیع کو تنگ و محدود کر دیا۔ جب حضرت رسول کریم سے شرح صدر کے معنی پوچھے گئے جس کا ذکر مندرجہ ذیل آیت قرآنی میں ہے:

فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام۔

جب خدا کسی کو ہدایت دینا چاہتا ہے تو وہ اس کا قلب اسلام کے لئے کھول دیتا ہے

تو آں حضرت نے فرمایا:

هو نور یقذفه الله تعالیٰ فی القلب — وہ ایک نور ہے جس کو اللہ تعالیٰ دل میں ڈال دیتا ہے

پھر پوچھا گیا کہ اس کی علامت کیا ہے؟ آں حضرت نے فرمایا:

التجافی عن دار الغرور والانابة الی دار الخلود۔ — دنیا سے منہ پھیرنا جو دارِ غرور ہے اور عاقبت کی طرف رجوع کرنا جو دارِ پائدار ہے۔

اور یہی مطلب ہے اُس حدیث کا جس میں آں حضرت نے فرمایا:

ان الله تعالیٰ خلق الخلق فی ظلمة ثم رش علیهم من نوره۔ — اللہ تعالیٰ نے خلقت کو اندھیرے میں پیدا کیا پھر ان پر اپنا نور چھڑکا۔

پس اس نور سے کشف (حقائق) کو طلب کرنا چاہئے نہ صرف دلائل عقلیہ سے۔

کیا یہ روشنی یا نور یا تجلی عقل سے کوئی علیحدہ چیز ہے یا اُسی کا مکمل تتمہ؟ متقدمین غزالی کی رائے یہی ہے کہ نور ایک ذریعۂ علم ہے جو عقل کے بعد پیدا ہوتا ہے اور جس کے ذریعہ عالمِ غیب اور زمانۂ مستقبل کی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں جو عقل کی دسترس سے باہر ہیں۔ اسی طرح احیاء العلوم (جلد سوم، باب اوّل، بیان ۷-۹) میں ان کی بحث سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک نور و تجلی علمی اکتساب کے بعد حاصل ہو سکتی ہے بشرطیکہ قلبِ انسانی دنیاوی علائق سے پاک ہو۔ اس کو دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ اگر کوئی انسان تحصیل علوم کے بعد مسائل حاضرہ پر پورے انہماک، خلوص نیت اور جذبۂ خدمت سے توجہ کرے تو وہ مسائل کے حل میں ایک روشن و واضح برہان پا سکتا ہے جس کے بعد اس کے لئے سارے پیچیدہ عقدے وا ہو جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں غزالی نے دو مثالیں دی ہیں جن سے وہ اپنا مفہوم واضح کرنا چاہتے ہیں۔ فرض کرو کہ ایک حوض زمین میں کھدا ہوا ہے۔ اس میں پانی پہنچانے کے دو طریقے ہیں۔ یا تو اوپر سے نالیاں بنا کر کسی جگہ سے اس میں پانی بھر دیا جائے یا زمین کو اتنا کھودا جائے کہ خود بخود اندر سے پانی نکل آئے۔ یہ دوسرے طریقے کا پانی صاف بھی زیادہ ہوگا اور ہمیشہ بھی رہے گا۔ پس قلب کو حوض سمجھنا چاہئے اور علم کو پانی اور حواسِ خمسہ کو مثل نالیوں کے تصور کرنا چاہئے۔ یعنی حواس کے ذریعہ بھی علم حاصل ہو سکتا ہے اور قلب کی صفائی کی جائے تو خود اس میں سے بھی علم کا چشمہ پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر دل میں علم موجود نہ ہو تو اس کے اندر سے چشمہ کس طرح پیدا ہوگا؟ اس کا جواب غزالی کے پاس کچھ نہیں اور وہ محض یہ کہہ کر ٹال دیتا ہے کہ یہ اسرارِ قلبی میں سے ہے۔

اس کے بعد دوسری مثال ملاحظہ کیجئے۔ کسی بادشاہ کے سامنے ذکر ہوا کہ اہلِ روم و اہلِ چین نقاشی کے کام میں بہت ماہر ہیں۔ بادشاہ نے فیصلہ کیا کہ ایک کمرے کا ایک رُخ تو چین والوں کے سپرد کر دیا جائے اور دوسرا روم والوں کے اور

بیچ میں ایک پردہ ڈال دیا جائے تاکہ کوئی دوسرے کی کاریگری سے باخبر نہ ہونے پائے۔ روم والوں نے اپنی طرف کی سجاوٹ کے لئے بے شمار قسم کے رنگ منگوائے مگر چین والوں نے صرف دیوار کو جلا دینے پر اکتفا کیا۔ مدت معینہ کے بعد جب پردہ ہٹایا گیا تو چین والوں کی طرف روم والوں کی طرف سے زیادہ آراستہ تھی کیونکہ مقابل کی دیوار کا ہر نقش اس میں منعکس تھا۔ غزالی کا خیال ہے کہ چینی طریقہ صوفیا کا ہے جو قلب کی صفائی سے اپنا مقصود حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن وہ سوال جو پہلی مثال میں اٹھایا گیا تھا یہاں بھی پیدا ہوتا ہے۔ فرض کیجئے کہ چین والے تو دیوار کو خوب چمکاتے لیکن روم والوں نے اپنے حصے کی دیوار پر کوئی نقش و نگار نہیں بنائے تو پھر پردہ اٹھنے کے بعد ان کا چمکانا کس کام آئے گا؟ وہاں تو وہی روز اول والا دن ہوگا۔ اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اکتساب علم کے بغیر اول تو نور کا چمکنا ممکن ہی نہیں اور اگر تجلی میسر ہو بھی تو اس تجلی سے علم سے عاری قلب کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ وہاں کچھ ہوگا تو تجلی اس کو منور کر سکتی ہے اور اگر وہاں قلب بالکل سفید کاغذ کی طرح ہو تو وہ روشنی اس پر کچھ اپنی طرف سے لکھ نہیں سکتی۔ حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے کہ علم کی تحصیل بھی اسی طرح ناگزیر ہے جس طرح قلب کی صفائی جو آفلین کی محبت سے خالی ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ عقل و وجدان کے صحیح امتزاج سے ہی ایک بلند سیرت اور کردار پیدا ہوتا ہے۔

شیخ شہاب الدین سہروردی نے عوارف المعارف (باب چہارم) میں مفکرین کی چار قسمیں بیان کی ہیں۔ سالک، مجذوب، سالک مجذوب، مجذوب سالک۔ سالک وہ شخص ہے جس کی تمام تگ و دو صرف علمی اکتساب تک محدود رہ جائے اور اسے کوئی تجلی میسر نہ آئے۔ مجذوب وہ ہے جسے تجلی تو حاصل ہو جائے لیکن اس کا دل علوم و معارف علمیہ سے بالکل بے بہرہ ہو۔ شیخ سہروردی کے نزدیک یہ دونوں قسم کے لوگ بہت نچلے درجے میں مقیم ہوتے ہیں، ان سے کسی تخلیقی یا تعمیری کام کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو زندگی کا آغاز اکتساب علم سے کریں لیکن ایک منزل پر جا کر ان کو تجلی میسر آ جائے اور چوتھی قسم کے وہ لوگ ہیں جن کا قلب آغاز ہی میں تجلی سے منور ہو جائے لیکن بعد میں وہ اکتساب علم پر تیار ہو جائیں۔ اگرچہ شیخ سہروردی اس آخری قسم کو یعنی مجذوب سالک کو بلند ترین درجہ دیتے ہیں لیکن غزالی کے نزدیک سالک مجذوب بلند ترین منصب ہے۔ چنانچہ احیاء العلوم (جلد اوّل، باب اوّل، فصل دوم بیان سوم) میں ایک جگہ یوں ذکر کیا ہے کہ جنید بغدادی فرماتے ہیں کہ مجھ سے ایک روز میرے مرشد سری سقطی نے کہا کہ جب تم میرے پاس سے اٹھتے ہو تو کس کے پاس بیٹھتے ہو؟ میں نے کہا کہ محاسبی کے پاس۔ (محاسبی تصوف، کلام، فلسفہ، حدیث سبھی کے ماہر تھے) پھر جب میں آپ کے پاس سے اٹھا تو سنا کہ فرمایا کہ تجھ کو خدا علم اور حدیث والا صوفی کرے، صوفی حدیث والا نہ کرے۔ اس قول سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو شخص حدیث اور علم کو حاصل کر کے صوفی بنتا ہے وہ فلاح پاتا ہے اور جو علم سے پہلے صوفی بنتا ہے وہ اپنے نفس کو خطرے میں ڈالتا ہے یعنی غزالی کے نزدیک سالک مجذوب ایک بلند ترین منصب ہے جو کسی مفکر کو نصیب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ گوتم اور غزالی دونوں کے تجربات اسی نوعیت کے

تھے۔ اُنہوں نے زندگی کا آغاز اکتساب علم سے کیا جس کے باعث ان کے ذہن میں حیاتِ انسانی کے متعلق چند پیچیدہ سوالات پیدا ہوئے۔ اس ذہنی پریشانی کو دور کرنے کے لئے اُنہوں نے اپنے قومی علمی سرچشمہ سے سیراب ہونے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اس کے بعد اُنہوں نے از خود ان مسائل پر غور و خوض شروع کیا اس حالت میں کہ ان کا قلب ہر قسم کے خطرات و شہوات سے پاک ہو چکا تھا۔ یہی حالت تھی جب ان کے قلب پر روشنی نمودار ہوئی۔ اس روشنی نے ان کو تقلید اور رسم پرستی سے بالکل آزاد کر دیا۔ جب تک ان کی نگاہ مروجہ مذاہب فکر کی حدود کے اندر مقید رہی ان کی ذہنی پریشانی دور نہ ہو سکی کیونکہ ان حدود کے اندر رہ کر کوئی تخلیقی کام کی توقع نہ تھی۔ روشنی کا آنا گویا ان حدود سے متجاوز کرنا تھا۔ تقلید کی بندشوں کا توڑنا اور ایک بالکل الگ اور انوکھے طرزِ فکر کی بنیاد رکھنا تھا۔ غزالی کا خیال ہے کہ یہ تجلی مشکوٰۃ نبوت کا پرتو تھا یعنی اس نے قدیم و معاصر تمام مذاہب فکر سے ہٹ کر بلاواسطہ اس سرچشمہ سے اکتساب کیا جو تمام حقیقتوں کا منبع اور تمام نوروں کا مرکز ہے۔ گوتم نے اگرچہ اس قسم کا کوئی اعلان نہیں کیا لیکن اس کی تمام اجتہادی کوششوں کا اگر غائر مطالعہ کیا جائے تو اس سے یہی استنباط ہوتا ہے کہ اس نے تمام قدیم و جدید مذاہب ہائے فکر سے بالا ہو کر خالص اس سرچشمہ سے سیراب ہونے کی کوشش کی جو ویدوں اور اُپنشدوں میں محفوظ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بدھ کے پیروؤں نے بعد میں گوتم کے اجتہادات کو بالکل ایک مستقل حیثیت دیدی اور کوشش کی کہ اس کا رشتہ قدیم سرچشمہ سے بالکل منقطع کر دیا جائے لیکن اس بات کی قوی شہادت موجود ہے کہ گوتم کے نظریۂ حیات اور نظامِ اخلاق کی کلی بنیاد ان تصورات پر مبنی تھی جو اُپنشدوں میں موجود تھے اور جن سے اس نے سرمو انحراف نہ کیا۔

اس کی تحریک کو ہندو مت کے خلاف بغاوت کہنا حالات کی بالکل غلط تاویل ہوگی۔ اگر وہ بغاوت تھی تو ان نظریوں کے خلاف جن کو مختلف اربابِ فکر نے اس کے عہد میں رواج دیا تھا۔ اس کی ذہنی پریشانی اور قلبی کشمکش محض اس بات کی آئینہ دار ہے کہ اس کی طبیعت کو اُن حدود میں مقید رہنا گوارا نہ تھا۔ آخرکار کئی سالوں کی کوشش کے بعد اس کو ایک بالکل نیا راستہ نظر آیا جس پر چل کر اسے یقین تھا کہ وہ نہ صرف اپنی قوم بلکہ کل انسانیت کو تاریکی کے گڑھے سے نکال کر روشنی کی طرف لا سکے گا اور یہیں سے اس کی زندگی کا نیا باب شروع ہوتا ہے جس کے باعث ایشیا کے عوام کئی صدیوں تک اس کی تعلیم سے روحانی سکون حاصل کرتے رہے۔

(باقی)